دارالعلوم دیوبند کا قیام اور مفتی سعید خان کا انکشاف

حافظ زاہد حسین رشیدی سُنی اکیڈمی، چکوال

''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں: ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظِ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔'' (حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، سوانح قاسمی جلد۲، ص۲۲۳)

حضرت مولانا مفتی سعید خان صاحب الندوۃ ایجوکیشنل ٹرسٹ چھتر پارک اسلام آباد کے بانی اور ماہنامہ ''الندوۃ'' اور ''المناد'' کے بعد اب جامعہ مدنیہ لاہور کے ترجمان ماہنامہ ''الحامد'' کے مدیر ہیں۔

۱۹۹۵ء کے معروف خلافت آپریشن کے حوالہ سے مذہبی حلقوں میں متنازعہ حیثیت سے بھی متعارف ہیں اور مرزائیت ومرزائیت نوازی سمیت دیگر کئی ایک الزامات کا بوجھ بھی اُٹھائے ہوئے ہیں۔

خدا جانے رقیبوں کی شیریں لبی کا کمال ہے یا ہمارے مخدوم کی وسعتِ ظرفی؟ یا کچھ اور؟ مفتی صاحب کو کبھی بے مزہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

مفتی سعید خان صاحب کی کتابِ زندگی کا ٹائٹل بہت خوش نما ہے۔ مہمان نواز، ہنس مکھ، وسیع لائبریری، معلومات کا ذخیرہ اور دھیما مگر دل میں راہ کر جانے والا اندازِ بیاں۔ تاہم تفصیلی مطالعہ کی نوبت نہ انہوں نے آنے دی اور نہ ہم اپنی بساط کو دیکھتے ہوئے کوئی سبیل نکال سکے۔

چونکہ ان سطور سے مقصود حضرت مفتی صاحب کو دل نشین شخصیت کی زیرِ بحث لانا نہیں، اس لئے ''قصۂ جاناں'' سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہم اپنے مطلب کی بات پر آتے ہیں۔

ستمبر ۲۰۱۱ء کے کسی ستم گر پہر میں ہمیں دارالعلوم دیوبند (وقف) کا ترجمان ''مجلّہ ترجمان دارالعلوم

دیو بند'' موصول ہوا۔جس میں مولانا وارث مظہری صاحب کے سفرِ پاکستان کی روئیداد''اسلام آباد کا سفر'' کے عنوان سے شاملِ اشاعت تھی۔اس سفر نامہ کے صفحہ ۶۲/۶۳ پر حضرت مفتی صاحب موصوف کے متعلق ایک لرزہ خیز تحریر موجود ہے۔

ہماری گذارشات سے قبل اس تحریر کو بغور پڑھ لیجیے:

''رات میں کھانے کی میز پر مختلف اہم میز بان شخصیات میں سے ایک مفتی سعید صاحب بھی تھے۔لاہور کے ہمارے کرم فرما سجاد الٰہی صاحب سے ہماری فون پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔انہوں نے کہا تھا کہ مفتی صاحب ہم سے اسلام آباد میں ملیں گے اور لاہور آنے کی راہ ہموار کریں گے۔کیوں کہ ہمارا ویزا صرف اسلام آباد کے لئے ہی مخصوص تھا،اس لئے ان سے بطور خاص ملنے سے دل چسپی تھی۔سجاد الٰہی صاحب ایک بہت بڑے تاجر ہیں،لیکن اسی کے ساتھ نہایت علم دوست۔ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر ہندوستان سے شائع ہونے والی اہم اردو کتابیں اور درجنوں رسائل ومجلّات منگواتے اور انہیں اہل ذوق تک پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ہمارے میز بانوں نے بتایا کہ مفتی صاحب نہایت متمول ہونے کے ساتھ سیاسی اثر و رسوخ کے حامل اور علمی ذوق کے مالک ہیں،چناں چہ ان کا ایک ذاتی کتب خانہ بڑی تعداد میں اہم کتابوں پر مشتمل ہے۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ مولانا علی میاں ندوی کے مسترشد اور خلیفہ ہیں۔ہمیں نہیں معلوم کہ''مفتی'' ان کے نام کا جز تھا یا حقیقت میں انہوں نے افتا کی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔کھانے کی میز پر ان کی خوش طبعی اور اخلاق وتواضع متاثر کن تھا،لیکن ان کی باتیں بہت سنجیدہ نہیں تھیں،بلکہ کہنا چاہیے کہ چھیڑ چھاڑ والی تھیں۔ایک بات تو انھوں نے ایسی کہی جو ہم میں سے کسی کو بھی ہضم نہیں ہو پائی۔انھوں نے فرمایا کہ دارالعلوم دیو بند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے،اس کے لئے ضروری اراضی بانی دارالعلوم کو انگریزی حکومت نے عطا کی تھی،نہ صرف یہ،بلکہ اس کی تاسیس میں انگریزی حکومت کے کارندے بھی شریک تھے۔ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خود انگریزی حکومت کے تعاون واشتراک سے دارالعلوم کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔انھوں نے اس کے لئے''بشارت'' نامی کتابچے یا تحریر کا حوالہ دیا جو ان کے بقول خود دارالعلوم کی ابتدائی رودادوں میں شامل ہے۔میری اس بات کو

انھوں نے سرے سے قابل اعتناء نہیں سمجھا کہ دارالعلوم دیوبند کے مخالفین نے جن کی تعداد ماشاء اللہ کم نہیں ہے، ہندوستان و پاکستان سے لے کر بعض عرب ممالک تک مختلف زبانوں میں اس کے خلاف درجنوں کتابیں لکھ کر نفرت پھیلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، کبھی ایسا الزام اس پر نہیں لگایا۔ حالاں کہ ان کے لئے یہ انکشاف اسامہ بن لادن کی پاکستان میں موجودگی اور ہلاکت سے کم سنسنی خیز نہیں تھا۔ جنگ شاملی کے جرم میں مولانا قاسم نانوتویؒ سمیت بانیان واکابر دارالعلوم دیوبند کا ہمیشہ حکومت کی طرف سے تعاقب کیا جاتا رہا۔ رشید احمد گنگوہیؒ گرفتار ہو کر جیل بھی گئے۔ لیکن مفتی سعید صاحب کے لئے گویا یہ ساری باتیں بے معنی تھیں۔ وہ اخیر تک ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' پر مصر رہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مرشد مولانا ابوالحسن علی ندوی کے لئے بھی یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہوتی۔ اس نشست میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی مزعومہ شراب نوشی پر بھی گفتگو چھیڑ دی، جس سے طبعی تکدر فطری تھا۔

(مجلّہ ترجمان دارالعلوم دیوبند اپریل تا جون ۲۰۱۱ء)

محترم قارئین! حضرت مفتی صاحب کے مبینہ انکشاف کو ایک نظر پھر گہری نظر سے پڑھیے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دیوبند کے فرزندوں کے لیے ان کے مادرِ علمی اور مرکزِ رشد و ہدایت کے متعلق یہ کہنا (کہ نہ صرف اس کی زمین انگریز کی عطاء ہے بلکہ اس کی تقریب تاسیس میں ان کے نمائندے بھی شریک ہوئے) ایسی گالی ہے جسے کوئی باہوش اور غیرت مند بیٹا برداشت نہیں کرسکتا؟!۔

باوجود اس کے ہم نے حضرت مفتی صاحب سے رابطہ ضروری خیال کیا۔ اس امکان کو سامنے رکھتے ہوئے کہ شاید وارث مظہری صاحب نے مکمل غلط بیانی سے کام لیا ہو یا مفتی صاحب کی گفتگو (Miss Code) کی ہو۔

چنانچہ ہم نے یکے بعد دیگرے تین خطوط ان کی خدمت میں ارسال کئے، تاکہ وہ اس مبینہ انکشاف کی تردید یا وضاحت فرمادیں۔ ہماری یہ التجائیں بھی ایک نظر دیکھ لیجیے:

''بگرامیٔ خدمت حضرت مفتی صاحب زید مجدکم:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

گذشتہ دنوں مجلّہ ترجمان دارالعلوم دیوبند (انڈیا) اپریل تا جون ۲۰۱۱ء دیکھنے کو ملا، جس میں وارث مظہری صاحب کا سفرنامہ ''اسلام آباد کا سفر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یقیناً آنجناب کی نظر سے گزرا ہوگا۔ وارث مظہری صاحب نے

آپ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

''انہوں نے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے، اس کے لئے ضروری اراضی بانی دارالعلوم کو انگریز حکومت نے عطاء کی تھی۔''

اس حوالہ سے کوئی رائے قائم کرنے یا تبصرہ کرنے اور آگے نقل کرنے سے قبل دیانتاً ضروری خیال کیا کہ آنجناب کی رائے معلوم کرلی جائے، امید ہے انتظار کی کوفت سے بچاتے ہوئے جلد اپنے نکتۂ نظر سے آگاہ فرمائیں گے۔ (۲۷ستمبر ۲۰۱۱ء)

اس عریضہ کی وصولی کی اطلاع ہمیں مفتی صاحب نے بنفسِ نفیس دی۔ ہمارے ایک دیرینہ اور مشترکہ دوست بھی ان کے ہمراہ تھے اور خوشی کا اظہار بھی کیا کہ آپ نے مجھ سے رابطہ کرکے ٹھیک کیا اور وعدہ فرمایا گیا کہ بہت جلد اس کی وضاحت کردی جائے گی۔

تاہم ایک مہینہ کے انتظار کے بعد بھی جب مفتی صاحب نے اپنا نکتۂ نظر بیان نہ فرمایا تو دوسرا عریضہ ارسال کیا گیا، جس میں دردِ دل یوں ذکر تھا:

''وارث مظہری صاحب کے مندرجات کی توضیح کا آں جناب نے جو وعدہ فرمایا تھا تا حال وفا نہیں ہوسکا: کسی بھی چیز کے نقصان سے بسا اوقات آپ جیسے بڑے اتنے آگاہ نہیں ہوسکتے، جتنے ہم چھوٹے کثرتِ مجالست یا بے تکلفی کی وجہ سے ہوجاتے ہیں۔ میری گزارش کی بنیاد یہی ہے، باقی زہے نصیب، جو مزاجِ یار میں آئے''۔ (۳۰اکتوبر ۲۰۱۱ء)

ہمارا یہ خط بھی حضرت مخدوم کو وصول ہوا، جس کی اطلاع ہمیں بذریعہ فون دی گئی۔ اس موقع پر موصوف فون پر ہی وضاحت کے موڈ میں تھے، جبکہ ہم ٹریفک میں پھنسے راستہ تلاش کرنے کی جستجو میں۔ چنانچہ تفصیلی بات نہ ہوسکی، البتہ مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ سلفی صاحب اور دیگر کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ وضاحت نہ کی جائے۔ راقم نے گزارش کی کہ اگر آپ نے کہیں ایسی کوئی چیز پڑھی ہے تو اس کی توجیہ بھی تو ممکن ہے، لیکن اس معاملہ کو نظر انداز کرنا قالین کے نیچے مٹی دبا دینے کے مترادف ہوگا، لہٰذا آپ قلم پکڑیئے اور بسم اللہ کیجیے۔

ڈیڑھ ماہ خاموشی رہی، بالآخر ہم نے اسے توڑتے ہوئے تیسرا عریضہ لکھا، جس میں ہم نے کچھ یوں فریاد کی:

ماہنامہ ''الحامد نومبر ۲۰۱۱ء'' نظرنواز ہوا، ابتدائی سطور میں آنجناب نے بالکل بجا لکھا ہے:

''مسلمہ قاعدہ ہے کہ انسان کی زبان سے زیادہ اس کی تحریر قابل اطمینان

ہوتی ہے۔''

شاید اسی بنیاد پر راقم کی گذارش تھی کہ مجلّہ ترجمانِ دارالعلوم میں اپنے کوڈ شدہ الفاظ کی آنجناب اپنے قلم سے وضاحت فرمادیں گے تو ریکارڈ درست ہوجائے گا اور شکوک وشبہات کے بادل چھٹ جائیں گے۔ بصورتِ دیگر آپ کی طرف سے کسی تردید کا نہ آنا مروجہ اصولوں کی بنیاد پر آپ کی تائید تصور ہوگا۔ ارشاد کے مطابق سلفی صاحب سے بات کی تھی، انہیں آپ نے اپنی وضاحت کا جو خاکہ بتایا، وہ اس پر مطمئن نہ تھے۔ نفسِ وضاحت پر سلفی صاحب یا کسی اور بزرگ کو کیا اشکال ہوسکتا ہے؟۔ (۱۴؍دسمبر ۲۰۱۱ء)

اس عریضہ کی وصولی کی تاحال ہمیں براہِ راست کوئی اطلاع نہ مل سکی، لیکن حضرت مفتی صاحب کی طرف سے گہرا سکوت ہماری الجھن دور نہیں کرسکا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجلّہ ''ترجمان دارالعلوم'' کے بعد یہ سفرنامہ ماہنامہ ''افکار ملی علی گڑھ (انڈیا) جولائی ۲۰۱۱ء'' میں بھی چھپ چکا ہے اور وہ طبقات جو بزرگانِ دیوبند کو مطعون کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، ان رسائل کی فوٹو کاپیز کرواکر تقسیم کررہے ہیں اور یہ تأثر پھیلا رہے ہیں کہ اب تو گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھادیا ہے۔

خدا کرے! ہماری یہ سطور ان ناعاقبت اندیش دوستوں کے لئے آئینہ ثابت ہوں اور وہ مفتی صاحب کے مبینہ انکشاف پر بغلیں بجانے کے بجائے بزرگان دیوبند کو تاریخ، روشن ماضی اور چاردانگِ عالم پھیلتے علمی وروحانی فیضان کی روشنی میں دیکھ سکیں:

اِن خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے

دارالعلوم دیوبند کے قیام کی مختصر تاریخ:

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد، قیام کی ضرورت اور احوالِ واقعی کے متعلق حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تحریر اساسی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی جامعیت ان سب تحریرات سے بے نیاز کردیتی ہے جو اس حوالہ سے لکھی گئی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

''تیرھویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی۔ ہندوستان میں اسلامی شوکت کا چراغ گل ہوچکا تھا۔ صرف اٹھتا ہوا دھواں رہ گیا تھا جو چراغ بجھ جانے کا اعلان کررہا تھا۔ دہلی کا تختِ مغل اقتدار سے خالی ہوچکا تھا۔ صرف ڈھول کی منادی میں ''ملک بادشاہ کا'' رہ گیا تھا۔ اسلامی شعائر رفتہ رفتہ رو بہ زوال تھے۔ دینی علم اور تعلیم گاہیں پشت پناہی ختم ہوجانے کی وجہ سے ختم ہورہی تھیں۔ علمی خانوادوں کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا جاچکا تھا۔ دینی شعور

رخصت ہو رہا تھا اور جہل و ضلال مسلم قلوب پر چھاتا چلا رہا تھا۔ مسلمانوں میں پیغمبری سنتوں کی بجائے جاہلانہ رسوم و رواج، شرک و بدعت اور ہوا پرستی وغیرہ زور پکڑتے جا رہے تھے۔ مشرقی روشنی چھپی جا رہی تھی اور مغربی تہذیب و تمدن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا، جس سے دہریت والحاد فطرت پرستی اور بے قیدیٔ نفس، آزادی فکر اور بے باکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جس سے نگاہیں خیرہ ہو چلی تھیں۔ اسلام کی جیتی جاگتی تصویر بیمار آنکھوں میں دھندلی نظر آنے لگی تھی اور اتنی دھندلی کہ اسلامی خدوخال کا پہچاننا مشکل ہو چکا تھا۔ چمن اسلام میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ خوش آواز اور شیریں ادا پرندوں کے زمزمے مدہم ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ زاغ وزغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی اور اسی قسم کے ہزارہا حوادث اور المناک واقعات کے چند اجمالی عنوانات ہیں جن سے اس وقت کے ہندوستان کی مسموم فضا کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

اند کے باتو بگفتیم و بدل ترسیدیم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ان حالات سے یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ اب ہندوستان بھی، اسپین کی تاریخ دہرانے کے لئے کمربستہ ہو چکا ہے کہ اچانک چند نفوس قدسیہ نے بالہام خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستہ سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دین کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ دینی تعلیم کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم وتربیت کے راستہ سے ان کے دل و دماغ کی تعمیر کر کے ان کی بقاء کا سامان کیا جائے اور اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے جس میں علومِ نبویہ پڑھائے جائیں اور ان ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے، جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کی داخلی راہ نمائی ہو اور دوسری طرف خارجی مدافعت۔ نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایمان دارانہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔ ان مقاصد کے لئے کمر باندھ کر اٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے راہنما

اور لیڈر نہ تھے، بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء وقت تھے اور ان کی باہمی گفت و شنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلہ خیال نہ تھا، بلکہ تبادلۂ الہامات تھا، جیسا کہ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سادس دار العلوم دیوبند سے سنا کہ وقت کے اولیاء اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کی واحد صورت بقاء مدرسہ ہے، چنانچہ اس مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حفظ دین و مسلمین کے لئے اب ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے، کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ: مدرسے کا قیام ضروری ہے، کسی نے کہا: مجھے صریح لفظوں میں کہا گیا ہے کہ: ان حالات میں مدرسے کا قیام بہت ضروری ہے۔ ان اہل اللہ کا اس تبادلۂ واردات کے بعد قیام مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالم غیب کا مرکب اجماع تھا جو قیام مدرسہ کے بارہ میں منجانب اللہ واقع ہوا۔

اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیام مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی نہ تھی، بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردہ میں ملک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہوئی تھی، جو محض مقامی یا ہنگامی نہ تھی، کیونکہ اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا اثر بھی مقامی نہ تھا، جس کے تدارک کی فکر تھی، وہ پورے ملک میں پڑ رہا تھا، اس لئے اس کے دفعیہ کی یہ ایمانی رنگ کی تحریک بھی مقامی انداز کی نہ تھی، بلکہ اس میں عالمگیری پنہاں تھی۔ گو ابتدا سے اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی، مگر اس وقت اس میں شجرہ طیبہ لپٹا ہوا تھا، جس کی جڑیں قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، اس سلسلہ میں ان نفوس قدسیہ کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ تھے، جنہوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھا اور اسے ایک تجویز کی صورت دی۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد یہ مبارک تجویز عملی صورت میں نمودار ہوئی اور ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ بمطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو دار العلوم کی بنیاد رکھ دی گئی۔ (بیس بڑے مسلمان ص: ۲۴ تا ۲۶)

بانی دار العلوم کے طے کردہ بنیادی اُصول:

حضرت مفتی صاحب کے مبینہ انکشاف میں تو بزرگانِ دیوبند پر دار العلوم کے لئے زمین

لینے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ جبکہ حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ یہ فرزندانِ توحید رجوع الی اللہ کو اصل سرمایہ قرار دیتے تھے۔ چنانچہ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم کے جو آٹھ اساسی اصول طے فرمائے، ان میں سے آخری تین حسبِ ذیل تھے:

۱:...اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی، جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیرِ محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

۲:...سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۳:...تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے چندے سے اُمیدِ ناموری نہ ہو، بالجملہ حسنِ نیت اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔ (بیس بڑے مسلمان ص:۲۷)

فرمایئے! جہاں بنیاد کے وقت یہ طے کیا جارہا ہو کہ......

۱:...مدرسہ کی کوئی یقینی آمدنی نہ ہوگی۔

۲:...مدرسہ بشرطِ توجہ الی اللہ چلے گا۔

۳:...اصل سرمایہ خوف ورجاء ہوگا جو رجوع الی اللہ سے حاصل ہوگا۔

۴:...سرکار اور امراء کی شرکت مضر تصور ہوگی۔

۵:...صرف مخلص اور حسنِ نیت کے حامل لوگوں سے چندہ لیا جائے گا۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایسے مدرسہ کی بنیاد کے لئے انگریز سے زمین لیں؟ اور انہیں تقریبِ تاسیس میں شریک کریں؟۔

خود دار ہوں کیوں آؤں درِ اہلِ کرم پر
کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی

(شکیب جلالی)

دارالعلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں:

دارالعلوم کی بنیاد کیسے رکھی گئی؟ اور بانیانِ دارالعلوم کے مقاصد واہداف کیا تھے؟ کن پیشین گوئیوں کی بنیاد پر تھے؟ ان سب سوالوں سمیت دیگر متعلقہ پہلوؤں کا جواب حضرت حکیم

الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی جامع ترین تحریر میں موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے!

''دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں ایک انار کا درخت ہے، اسی درخت کے نیچے سے آبِ حیات کا چشمہ پھوٹا اور اسی چشمہ نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبیاری شروع کردی اور دوسری طرف اس نے تیز و تند، شرک ''بدعت'' فطرت پرستی، الحاد و دہریت اور آزادیٔ فکر کے ان خس و خاشاک کو بھی بہانا اور راستہ سے ہٹانا شروع کردیا، جنہوں نے مسلمانوں کے قلوب میں جڑ پکڑ کر انہیں یہ روزِ بد دکھایا تھا۔ بانی دارالعلوم کا یہ خواب کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں، پورا ہوا اور مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہ کا یہ خواب کہ: ''علوم دینیہ کی چابیاں مجھے دی گئی ہیں'' خواب ہی نہ رہا، بلکہ حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہوگیا۔

اور اس مدرسہ کے ذریعے ان چابیوں نے ان قلوب کے تالے کھول دیئے جو علم کا ظرف تھے یا ظرف بننے والے تھے، جن سے علم کے سوتے ہر طرف سے پھوٹنے لگے اور چند نفوس قدسیہ کا علم آن کی آن میں ہزار ہا علماء کا حلم ہوگیا۔ حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تھے، جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ: ''مجھے اس جگہ سے علم کی بو آئی ہے، پس وہ خوشبو جس کو سید صاحبؒ کی روحانی قوتِ شامہ نے سونگھا تھا، ایک سدا بہار گلاب کے پھول، بلکہ گلاب آفرین درخت کی شکل میں آگئی، جس سے ہزاروں پھول کھلے اور ہندوستان کا اجڑا ہوا چمن تختۂ گلاب بن گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوشبو بیج بنے گی، بیج سے کلی کھلے گی، شگفتہ کلی سے پھول بنے گی، پھول سے گلدستہ بنے گی اور اس گلدستہ کی خوشبو سے سارا عالم انسانی مہک اُٹھے گا اور کسے پتہ تھا کہ ایشیا کی فضا میں مغربی استعماریت کے جو جراثیم پھیلے ہوئے ہیں، وہ اس کی جراثیم کش مہک سے آپ ہی اپنی موت مرنے شروع ہوجائیں گے۔ چنانچہ اس وقت کے برطانوی ہند میں نئی فاتح قوم انگریز کو فکر تھی کہ ہندوستان کے دل و دماغ کو یورپین سانچوں میں کس

طرح ڈھالا جائے، جس سے برطانویت اس ملک میں جڑ پکڑ سکے۔ ظاہر ہے کہ دل و دماغ کے بدل دینے کا واحد ذریعہ تعلیم ہوسکتی تھی، جس نے ہمیشہ ان سانچوں میں دلوں اور دماغوں کو ڈھالا ہے، جن کو لے کر تعلیم آگے آئی ہے، اس لئے ہندوستان کو فرنگی رنگ میں ڈھالنے کے لئے لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کی اور وہ اسکولی اور کالجی تعلیم کا نقشہ لے کر یورپ سے ہندوستان پہنچا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ: ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔ یقیناً یہ آواز جب کہ ایک فاتح او برسر اقتدار قوم کی طرف سے اور تھا بھی وہ تعلیم کا، جو بذات خود ایک انقلاب آفریں حربہ ہے تو اس نے ملک پر ذہنی انقلاب کا خاطر خواہ اثر ڈالا۔ اس تعلیم سے ایسی نسلیں ابھرنی شروع ہوگئیں جو اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں، لیکن اپنے طرز فکر اور سوچنے کے ڈھنگ کے اعتبار سے انگریزی جامہ میں نمایاں ہونے لگیں اس ذہنی مگر خطرناک انقلاب کو دیکھ کر بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے دارالعلوم قائم کر کے اپنے عمل سے یہ نعرہ بلند کیا کہ:

''ہماری تعلیم وتمدن کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو''۔ اس کا ثمرہ یہ نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات پر بریک لگ گیا اور بات یکطرفہ نہ رہی، بلکہ ایک طرف اگر مغربیت شعار افراد نے جنم لینا شروع کر دیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز جتھہ بھی برابر کے درجہ میں سامنے آنا شروع ہوگیا۔ جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک وتر کو بہالے جائے گا، اگر اس کی روکا ریلا بہاؤ پر آئے گا تو ایسے بند بھی باندھ دیئے گئے ہیں، جو اُسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔ بہرحال وہ ساعت محمود آگئی کہ مدرسہ کا آغاز ہوا اور اس کی تعمیری و دفاع کی ملی جلی تعلیم عملاً ساخت وجود پر آگئی۔ ملا محمود دیوبندیؒ نے (جو حضرت بانی دارالعلوم کے امر پر مدرسۂ دیوبند کا یہ تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کے لئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے) اپنے ایک شاگرد کو کہ ان کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخر کار شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے) بٹھا کر کسی

عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو، بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہور عالم درس گاہ دار العلوم دیو بند کا افتتاح کر دیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا، نہ شہرت پسندی کا ردکار اور جذبہ، نہ نام ونمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹر واشتہارات کی بھرمار، بس ایک شاگرد اور ایک استاذ، شاگرد بھی محمود استاذ بھی محمود۔ دونفر سے یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آگئی۔ سادگی اور ندرت ایمان کا دور دورہ شروع ہو گیا، جو سنت نبوی اور اتباع سلف کی روح ہے۔ مقصد نہ ترفہ تھا، نہ تنعم، نہ تعیش، نہ تزین، نہ تفاخر، نہ تکاثر، بلکہ صرف ما أنا علیه وأصحابیؓ'' کا مرقع بنانا اور ''علیکم بسنتی'' الخ ''وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ'' کی سیدھی راہ کی عملی تصویر کھینچی تھی اور اس تصویر کشی میں کمال احتیاط واعتدال بھی پیش نظر تھا کہ صراط مستقیم کے یہ خطوط کہیں ان بہتر ۷۲ فرقوں کے خطوط سے نہ مل جائیں جنہیں شریعت کی اصطلاح میں سبل متفرقہ کہا گیا ہے۔ اس لئے جامعیت و اعتدال اور دین وانش کے ملے جلے اندازوں کے ساتھ اس درس گاہ میں تعلیم وتربیت کا خط مستقیم کھینچا گیا''۔ (بیس بڑے مسلمان ص ۳۰/۲۹)

محترم قارئین! حضرت قاری صاحبؒ کی تحریر آپ نے ملاحظہ کی، گہری نظر سے جائزہ لیجیے، بزرگانِ دیو بند نے اس عظیم درس گاہ کے قیام کے وقت جو خواب دیکھا تھا، کیا آج اس کی تعبیر ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے؟ محض عقیدت ہی نہیں، حقیقت کی نگاہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ سے بھی کام لیا جائے تو یہ نتیجہ نکالے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس درس گاہ کی بنیادیں جس خلوص پر رکھی گئیں، یہ اسی کا ثمرہ ہے۔ انگریز کی عطاء کردہ زمین سے یہ نتائج تو نکلنے سے رہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ درس گاہِ دیو بند اس چبوترہ کا تسلسل ہے، جہاں پیغمبر ﷺ کے اصحاب فیضانِ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ جس طرح حضرت قاری صاحبؒ کی تحریر سے واضح ہے کہ سنت نبوی اور اتباع سلف کی روح ہمارا مقصود ہے۔ ہمارا مقصود ترفہ ہے، نہ تنعم، تعیش ہے، نہ تزین، تفاخر ہے، نہ تکاثر، بلکہ صرف ''ما أنا علیه وأصحابی اور علیکم بسنتی'' کی راہ..... گویا ؎

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(اقبالؒ)

بزرگانِ دیوبند کی انگریز کے خلاف جدوجہد:

ہندوستان کا خطہ روحانی پیشواؤں کا مرکز تھا، جس کے زیر اثر یہاں کے باشندوں میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کہ ایک مثالی انسان میں ہونی چاہئیں۔ لیکن ظالم انگریز نے تجارت کے بہانے یہاں قدم جمائے، تو نہ صرف یہ کہ یہاں کے وسائل پر قبضہ کرلیا، بلکہ اپنی بے ہودہ تہذیب، فرسودہ نظامِ تعلیم اور عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعے ہندوستان کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کردیا۔

فخر الہند حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حالات کی نزاکت بھانپتے ہوئے فرنگی اثرات کے انسداد کی غرض سے انقلابی جماعت کی بنیاد رکھی۔ بزرگانِ دیوبند کے مرشد قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اس مزاحمتی قبیلہ کے چوتھے امیر مقرر ہوئے تو انگریز کے خلاف باقاعدہ ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی شروع کردی۔ آپؒ کے رفقاء میں بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علاوہ قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا عبدالغنیؒ اور مولانا شیخ محمد تھانویؒ وغیرہ حضرت شامل تھے۔

حضرت حاجی صاحبؒ امام مقرر ہوئے، حضرت نانوتویؒ سپہ سالار اور حضرت گنگوہیؒ قاضی، جبکہ تھانہ بھون کو دارالسلام قرار دیا گیا۔ اس موقع پر مولانا شیخ محمد تھانویؒ نے بے سروسامانی کی طرف اشارہ کیا تو شیخ نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے فرمایا: ''کیا ہم اصحابِ بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟''

تفصیل بہت دل چسپ بھی ہے اور روح فرسا بھی۔ بزرگان دیوبند نے اس جدوجہد میں کیا کیا، کیا؟ اور کیسے کیسے قربانیاں دیں؟ بلاشبہ وہ جہاں رکے، کوہِ گراں ثابت ہوئے اور جب چلے تو جاں سے گذر گئے۔ ظالم انگریز نے کس قدر سفاکانہ اور حیا سوز حرکتیں ان سرفروشوں پر روا رکھیں اور اصحابِ محمد کے یہ روحانی فرزند کس طرح سینہ تان کر ہر ظلم سہتے رہے، اس کا اندازہ مسٹر رسل کے اس اعتراف سے لگایا جاسکتا ہے۔: ''مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے پہلے خنزیر کی چربی ان کے بدن پر ملی گئی اور پھر انہیں جلا دیا گیا''۔

(تمغہ کا دوسرا رخ، مصنفہ ایڈورڈ ٹامس، ص: ۴۸۰ بحوالہ بیس بڑے مسلمان، ص: ۱۲۰)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، انگریز کے مظالم، بزرگانِ دیوبند کی جدوجہد، عیسائیت کے پھیلتے اثرات کو دیکھتے ہوئے غلبۂ اسلام کے لئے دارالعلوم دیوبند کا قیام اور ایک طویل جدوجہد کے بعد ہندوستان کی آزادی کا لمحہ لمحہ تاریخ کے ریکارڈ پر ہے، جو تاریخ کے طالب کے لئے شاید محض دل چسپی کا سامان ہو، لیکن دیوبند کے بیٹوں کے لئے قابل فخر بھی ہے اور لائقِ تقلید بھی۔ تفصیلات کے لیے تاریخ سے رجوع کرنا چاہئے۔ یہاں اس سرگذشت کے اجمالی ذکر سے مقصود صرف حضرت

مولانا مفتی سعید خان صاحب کے اس مبینہ انکشاف:

''دارالعلوم دیوبند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے، اس کے لئے ضروری اراضی بانی دارالعلوم کو انگریزی حکومت نے عطاء کی تھی''۔

کا امکانی جائزہ لینا ہے۔ اور یہ جاننے کی کوشش کرنا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جن بزرگوں نے سالہا سال جس انگریز کی منحوس تہذیب، تعلیم، ناجائز قبضہ اور ہندوستان کو عیسائی اسٹیٹ بنانے جیسی کوشش کو ناکام بنانے کے لئے ایک طویل جدوجہد کی ہو، وہ اتنے سادہ تھے کہ انہی عطار کے لونڈوں سے دوا لیتے ہوئے اپنے علمی وروحانی مرکز کے لئے زمین لے لیں: **فیا للعجب!**

یا پھر انگریز اتنا باؤلا تھا کہ گویا سانپوں کو دودھ پلانے لگا اور اپنے خلاف جارحانہ عزائم رکھنے والوں کو مرکز قائم کرنے کے لئے زمین الاٹ کردی؟

کیا حضرت مفتی صاحب اس عقدہ کو حل کرسکتے ہیں؟؟؟:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
(اقبالؒ)

کاش! شورش کاشمیری زندہ ہوتے:

حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کو جو سنہری اصول عطاء کئے ہیں ان میں ایک اصول اپنی معنویت، گہرائی اور اثرات کے حوالہ سے ایک جہان رکھتا ہے: "**اذکروا محاسن موتاکم**" یعنی ''اپنے مردوں کی اچھی باتیں ذکر کیا کرو''

عقائد ونظریات کی بات الگ ہے، تاہم اگر کہیں عملی کمزوری موجود ہے تو بجائے اس کے اس فرد کی اچھی باتیں بیان کی جائیں، خدا جانے حضرت مفتی صاحب کی دلربا شخصیت یہ انکشاف کیسے کر بیٹھی؟ کہ وارث مظہری چکرا کر رہ گئے کہ:

''اس نشست میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی مزعومہ شراب نوشی پر بھی گفتگو چھیڑ دی، جس سے طبعی تکدر فطری تھا۔''

کاش مولانا ابوالکلامؒ کے عاشقِ زار جناب شورش کاشمیری مرحوم حیات ہوتے تو تڑپ کر رہ جاتے اور اپنے محبوب آزادؒ کی وکالت کرتے یا حضرت مفتی صاحب موصوف سے حساب مانگتے .....

ہندوستان میں ابن تیمیہؒ:

آغا شورش کاشمیریؒ کو حضرت آزادؒ سے گہرا لگاؤ تھا، انہوں نے ''ہندوستان میں ابن تیمیہؒ''

نامی کتاب سمیت دیگر کئی ایک تحریرات میں مولانا آزادؒ کی شخصیت سے پردہ اٹھایا ہے: چند ایک شذرات مذکورہ کتاب سے ملاحظہ کیجیے اور مولانا آزادؒ کی باغ و بہار شخصیت اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگائیے:

''مولانا ابوالکلام آزادؒ ماضی کی کوئی داستان نہیں، ایک زندہ و تابندہ فکر، پختہ اسلامی سیرت کا نمونہ، وقت کی تاریکیوں میں روشنی، دین کی صداقت پر حجت، آیت من آیات اللہ، عصرِ حاضر میں مذہب، تعلیم اور تہذیب و معاشرت کے پیچیدہ مسائل میں چراغِ ہدایت اور سیاست کی پر پیچ راہوں میں ایک راہ نما قدم ہیں''۔ (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری ص:۱۳)

''ابوالکلامؒ نہ ہوتے تو تاج محل ہوتے اور اگر تاج محل انسانی پیکر میں ڈھل جائے تو وہ ہرگز ہرگز ابوالکلامؒ نہیں ہوسکتا''۔ (آغا شورش کاشمیریؒ: ص:۱۸)

عربوں میں ہوتے تو ابن تیمیہؒ ہوتے، ہندوؤں میں ہوتے تو اب تک ان کے بت پجتے ہوتے، لیکن وہ مسلمانوں میں تھے، اس لئے ان کے حصے میں وہ سب کچھ آیا جس سے علمائے امت کی جبینیں لبریز ہیں۔ (آغا شورش کاشمیریؒ: ص:۱۸)

''ان سطروں کے لکھتے وقت مجھے یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابنِ تیمیہؒ اور ابن قیمؒ یا شمس الائمہ سرخسیؒ اور اُمیہ بن عبدالعزیزؒ کے حالات تو نہیں لکھ رہا''۔

(مولانا سید سلیمان ندویؒ: ص:۴۷)

ڈوبتی رات کے ساتھ سورۂ یٰسین پڑھی گئی، بالآخر سوا دو بجے شب موت نے اس عظیم انسان کے لئے اپنا دامن وا کر دیا جو اس گئے گزرے دور میں سب سے بڑا مسلمان تھا، اللھم اغفرلہ کنگ ایڈورڈ کی کوٹھی میں سینکڑوں لوگ ٹھٹھرتی ہوئی رات کو اپنے دل کی گرمی پہنچا رہے تھے، جب ٹوٹتی ہچکی نے ان کے کان میں کہا: ''تمہارا مرجعِ ارادت اپنے اللہ کے پاس چلا گیا۔''

کہرام مچ گیا، دہلی نے آخری بار سر جھکا دیا کہ اس کی عظمت کے طاق پر جلتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے گل ہوگئی ہے، تمام ہندوستان نے اشکبار چہروں کے ساتھ اپنے جھنڈوں کو سرنگوں کر دیا اور جہاں جہاں جھنڈے جھکائے جا رہے تھے، وہاں لوگوں نے اپنے دلوں کے پرچم جھکا دیئے تھے کہ اس دور کا ابن تیمیہؒ رحمتِ خداوندی کی گود میں جاتا ہے۔ (آغا شورش مرحوم: ص:۸۷)

مولانا احمد سعید دہلویؒ صدر جمعیۃ علماء ہند نے دو بج کر پچاس منٹ پر نمازِ جنازہ پڑھائی۔ امام نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہا تو قلعہ اور مسجد کا قلب

ایک مرتبہ پھر نعرۂ تکبیر ''اللہ اکبر'' کی صداؤں سے معمور ہوگیا۔ اور جب میت لحد کے قریب لائی گئی تو ہزار ہا ہندو اور سکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے، فوج نے تعزیتی بگل بجائے، ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں نے بیک زبان اللہ کے ایک اور محمد ﷺ کے رسول ہونے کا اقرار کیا۔

مولانا احمد سعیدؒ نے لحد میں اتارا۔ کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا ایک یادگار جسم سفید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔ مسلمانوں اور نامسلمانوں میں غم کی یکسانی کے باوجود دو کا فرق تھا۔ مسلمانوں کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا، ''اب کیا ہوگا؟ ہماری آخری امید بھی ٹوٹ گئی مولانا دفن نہیں ہو رہے، ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان دفن ہو رہے ہیں''۔ (آغا شورشؒ: ص: ۹۳/۹۴)

عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہیں آستیں نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے افق پہ مہر مبیں نہیں ہے
تیری جدائی میں مرنے والے! وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تیری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے
کئی دماغوں کا ایک انسان میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے؟
قلم کی عظمت اجڑ گئی ہے زبان سے زور بیان گیا ہے
اتر گئے منزلوں کے چہرے امیر کیا کارواں گیا ہے
مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

(آغا شورش مرحوم: ص: ۲۲۸)

جی تو چاہتا ہے کہ مولانا آزادؒ کی شخصیت اور مناقب کا ایک دفتر نقل کر دوں، پر طوالت کا خوف مانع ہے۔

قارئین گہری نظر سے مذکورہ بالا سطور کو از سرِ نو پڑھیں اور انصاف سے بتائیں، کیا کوئی مے نوش بھی ایسے ایسے اوصافِ حمیدہ سے موصوف ہوسکتا ہے؟؟؟۔

حقیقت کس طرح اہلِ جہاں کے سامنے آئے
حقیقت کو تو افسانہ بنا رکھا ہے دنیا نے

(زکی زکائی)